

تفہیم القرآن

المؤمن

(۲)

عرش الہی کے حامل فرشتے، اور وہ جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں، سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: آے ہمارے رب، تو اپنی رحمت اور

ملا یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی تسبیح کے لیے ارشاد ہوئی ہے۔ وہ اس وقت کفار مکہ کی زبان درازیاں اور چہرہ دستیاب، اور ان کے مقابلہ میں اپنی بے بسی دیکھ دیکھ کر سخت دل شکستہ ہو رہے تھے۔ اس پر فرمایا گیا کہ ان گھٹیا اور ذلیل لوگوں کی باتوں پر تم رنجیدہ کیوں ہوتے ہو، تمہارا مرتبہ تو وہ ہے کہ عرش الہی کے حامل فرشتے، اور عرش کے گرد و پیش حاضر رہنے والے ملائکہ تک تمہارے حامی ہیں اور تمہارے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور سفارشیں کر رہے ہیں۔ عام فرشتوں کے بجائے عرش الہی کے حامل اور اس کے گرد و پیش حاضر رہنے والے فرشتوں کا ذکر یہ تصور دلانے کے لیے کیا گیا کہ سلطنت خداوندی کے عام اہل کار تو درکنار، وہ ملائکہ مقربین بھی جو اس سلطنت کے ستون ہیں اور جنہیں فرما کر اسے کائنات کے ہاں قرب کا مقام حاصل ہے، تمہارے ساتھ گہری دلچسپی و مہمردی رکھتے ہیں پھر یہ جو فرمایا گیا کہ یہ ملائکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کا رشتہ ہی وہ اصل رشتہ ہے جس نے عرشوں اور فرشتوں کو ملا کر ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور اسی تعلق کی وجہ سے عرش کے قریب رہنے والے فرشتوں کو زمین پر بسنے والے اُن خاکی انسانوں سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے جو انہی کی طرح

اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھپایا ہوا ہے، پس معاف کروے اور عذابِ دوزخ سے بچائے۔ اُن لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے ہمارے رب، اور داخل کر اُن کو ہمیشہ رہنے والی اُن جنتوں میں جن کا تو نے اُن سے وعدہ کیا ہے، اور اُن کے

اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ فرشتوں کے اللہ پر ایمان رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کفر کر سکتے تھے، مگر انہوں نے اسے چھوڑ کر ایمان اختیار کیا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ وحدہ لا شریک ہی کا اقتدار مانتے ہیں، کوئی دوسری سستی ایسی نہیں ہے جو انہیں حکم دینے والی ہو اور وہ اُس کے آگے سرطاعت جھکاتے ہوں۔ یہی مسلک جب ایمان لانے والے انسانوں نے بھی اختیار کر لیا تو اتنے بڑے اختلاف جنس اور بُعد مقام کے باوجود اُن کے اور فرشتوں کے درمیان ہم مشرفی کا مضبوط تعلق قائم ہو گیا۔

یعنی اپنے بندوں کی کمزوریاں اور نعرِ شمش اور خطا میں تجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہیں، تیرے تو سب کچھ جانتا ہے، مگر تیرے علم کی طرح تیرا دامنِ رحمت بھی تو وسیع ہے، اس لیے ان کی خطاؤں کو جاننے کے باوجود ان غریبوں کو بخش دے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بر بنائے رحمت اُن سب لوگوں کو بخش دے جن کو بر بنائے علم تو جانتا ہے کہ انہوں نے سچے دل سے توبہ کی اور فی الواقع تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

۱۰۔ معاف کرنا اور عذابِ دوزخ سے بچالینا اگرچہ صریحاً لازم و ملزوم ہیں اور ایک بات کا ذکر کرنے کے بعد دوسری بات کہنے کی بظاہر کوئی حاجت نہیں رہتی۔ لیکن اس طرزِ بیان سے دراصل اہل ایمان کے ساتھ فرشتوں کی گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ کسی معاملے میں جس شخص کے دل کو لگی ہوئی ہوتی ہے وہ جب حاکم سے گزارش کرنے کا موقع پالیتا ہے تو پھر وہ الحاج کے ساتھ ایک ہی درخواست کو بار بار طرح طرح سے پیش کرتا ہے اور ایک بات بس ایک دفعہ عرض کر کے اس کی تسلی نہیں ہوتی۔

۱۱۔ یعنی نافرمانی چھوڑ دی ہے، سرکشی سے باز آگئے ہیں، اور فرمانبرداری اختیار کر کے

زندگی کے اُس راستے پر چلنے لگے ہیں جو تو نے خود بتایا ہے۔

والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ ہی پہنچا دے گا۔ تو بلاشبہ قادر مطلق اور حکیم ہے۔ اور بچا دے ان کو برائیوں سے لے۔ جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے بڑا رحم کیا، یہی بڑی کامیابی ہے۔

تہ اس میں بھی وہی الحاح کی کیفیت پائی جاتی ہے جس کی طرف اوپر حاشیہ نمبر ۸ میں ہم نے اشارہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ معاف کرنا اور دوزخ سے بچا لینا آپ سے آپ جنت میں داخل کرنے کو مستلزم ہے، اور پھر جس جنت کا اللہ نے خود مومنین سے وعدہ کیا ہے، بظاہر اسی کے لیے مومنین کے حق میں دعا کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، لیکن اہل ایمان کے لیے فرشتوں کے دل میں جذبہ خیر خواہی کا اتنا جوش ہے کہ وہ اپنی طرف سے ان کے حق میں کلمہ خیر کہتے ہی چلے جاتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ سب مہربانیاں ان کے ساتھ کرنے والا ہے۔

اللہ یعنی ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لیے ان کے ماں باپ اور بیویوں اور اولاد کو بھی ان کے ساتھ جمع کر دے۔ یہ وہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود بھی ان نعمتوں کے سلسلے میں بیان فرماتی ہے جو جنت میں اہل ایمان کو دی جائیں گی۔ ملاحظہ ہو سورہ رعد آیت ۲۳-۲۴ اور سورہ طور آیت ۲۱۔ سورہ طور والی آیت میں یہ تصریح بھی ہے کہ اگر ایک شخص جنت میں بلند درجے کا مستحق ہو اور اس کے والدین اور بال بچے اس مرتبے کے مستحق نہ ہوں تو اس کو نیچے لاکر ان کے ساتھ ملانے کے بجائے اللہ تعالیٰ ان کو اٹھا کر اس کے درجے میں لے جائے گا۔

اللہ "سیئات" برائیوں، کالقطہین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور تینوں ہی یہاں مراد ہیں۔ ایک غلط عقائد، بگڑے ہوئے اخلاق اور بُرے اعمال۔ دوسرے، مگر اسی اور اعمالِ بد کا وبال۔ تیسرے آفات اور مصائب اور آفتیں خواہ وہ اس دنیا کی ہوں یا عالمِ برزخ کی، یا روز قیامت کی۔ فرشتوں کی دعا کا مقصود یہ ہے کہ ان کو ہر اس چیز سے بچا جو ان کے حق میں بُری ہو۔

اللہ روز قیامت کی برائیوں سے مراد میدانِ حشر کا ہول، ساتے اور ہر قسم کی آسائشوں سے

جن لوگوں نے کفر کیا ہے، قیامت کے روز ان کو بپا کر کہا جائے گا "آج تمہیں جتنا شدید غصہ اپنے اوپر آ رہا ہے، اللہ تم پر اس سے زیادہ غضب ناک اس وقت ہوتا تھا جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم کفر کرتے تھے" وہ کہیں گے "اے ہمارے رب، تو نے واقعی ہمیں دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی دے دی، اب ہم اپنے قصور کا محرومی، محاسبے کی سختی، تمام خلائق کے سامنے زندگی کے راز فاش ہونے کی رسوائی، اور دوسری دو تمام ذلتیں اور سختیاں ہیں جن سے وہاں مجرمین کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔"

۵۷ یعنی کفار جب قیامت کے روز دیکھیں گے کہ انہوں نے دنیا میں شرک و دہریت، انکارِ آخرت اور رسولوں کی مخالفت پر اپنے پورے کارنامہ حیات کی بنیاد رکھ کر کتنی بڑی حماقت کی ہے اور اس حماقت کی بدولت اب وہ کس انجامِ بد سے دوچار ہوتے ہیں، تو وہ اپنی انگلیاں چبائیں گے اور جھنجھلا جھنجھلا کر اپنے آپ کو خود کو سنے لگیں گے۔ اُس وقت فرشتے ان سے بپا کر کہیں گے کہ آج تو تمہیں اپنے اوپر بڑا غصہ آ رہا ہے، مگر کل جب تمہیں اس انجام سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور دوسرے نیک لوگ راہِ راست کی طرف دعوت دیتے تھے اور تم ان کی دعوت کو ٹھکراتے تھے اس وقت اللہ تعالیٰ کا غضب اس سے زیادہ تم پر بھڑکتا تھا۔

۵۸ دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی سے مراد وہی چیز ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ، آیت ۲۸ میں کیا گیا ہے کہ تم خدا کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو جبکہ تم بے جان تھے، اُس نے تمہیں زندگی بخشی، پھر وہ تمہیں موت دے گا اور پھر دوبارہ زندہ کر دے گا۔ کفار ان میں سے پہلی تین حالتوں کا تو انکار نہیں کرتے، کیونکہ وہ مشاہدے میں آتی ہیں اور اس بنا پر ناقابلِ انکار ہیں۔ مگر آخری حالت پیش آنے کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کے مشاہدے میں ابھی تک نہیں آتی ہے اور صرف انبیاء علیہم السلام ہی نے اس کی خبر دی ہے۔ قیامت کے روز جب عملاً وہ چوتھی حالت بھی مشاہدے میں آجائے گی تب یہ لوگ اقرار کریں گے کہ واقعی وہی کچھ پیش آ گیا جس کی ہمیں خبر دی گئی تھی۔

۵۹ یعنی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس دوسری زندگی کا انکار کر کے ہم نے سخت غلطی کی اور اس غلط

اعتراف کرتے ہیں، کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ (جواب ملے گا) یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو، یہ اس وجہ سے ہے کہ جب ایک اللہ کی طرف بلا یا جاتا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو بلا یا جاتا تو تم مان بیٹھے۔ اب فیصلہ اللہ بزرگ و بزرگ کے ہاتھ ہے۔

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور آسمان سے تمہارے لیے رزق نازل کرتا ہے، مگر ان نشانیوں کے مشاہدے سے، سبق صرف وہی شخص امتیاز ہے جو اللہ کی نظریے پر کام کر کے ہماری زندگی گناہوں سے لبریز ہو گئی۔

۱۷ یعنی کیا اب اس کا کوئی امکان ہے کہ ہمارے اعتراف گناہ کو قبول کر کے ہمیں عذاب کی اس حالت سے نکال دیا جائے جس میں ہم مبتلا ہو گئے ہیں۔

۱۸ یعنی فیصلہ اب اسی ایکے خدا کے ہاتھ میں ہے جس کی خدائی پر تم راضی نہ تھے، اور ان دوسروں کا فیصلے میں کوئی دخل نہیں ہے جنہیں خدائی کے اختیارات میں حصہ دار قرار دینے پر تمہیں بڑا اصرار تھا۔ اس مقام کو سمجھنے کے لیے سورہ زمر آیت ۴۵ اور اس کا حاشیہ ۱۷ بھی نگاہ میں رہنا چاہیے، اس فقرے میں آپ سے آپ یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اب اس عذاب کی حالت سے تمہارے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں ہے، کیونکہ تم نے صرف آخرت ہی کا انکار نہیں کیا تھا بلکہ اپنے خالق و پروردگار سے تم کو چڑھتی اور اس کے ساتھ دوسروں کو ملائے بغیر تمہیں چین نہ آتا تھا۔

۱۹ نشانہ نشانوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ اس کائنات کا صانع اور مدبر و منتظم ایک خدا اور ایک ہی خدا ہے۔

۲۰ رزق سے مراد یہاں بارش ہے، کیونکہ انسان کو جنی اقسام کے رزق بھی دینا میں ملتے ہیں ان سب کا مدار آخر کار بارش پر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی بے شمار نشانیوں میں سے تمہارا اس ایک نشانی کو پیش کر کے لوگوں کو توجہ دلاتا ہے کہ صرف اسی ایک چیز کے انتظام پر تم غور کرو تو تمہاری

طرف رجوع کرنے والا ہو۔ پس اسے رجوع کرنے والو، اشد ہی کو بچار اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، خواہ تمہارا یہ فعل کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

وہ بلند رجوع والا، مالکِ عرش ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے

سمجھ میں آجائے کہ نظامِ کائنات کے متعلق جو تصور تم کو قرآن میں دیا جا رہا ہے وہی حقیقت ہے۔ یہ انتظام صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا تھا جبکہ زمین اور اس کی مخلوقات اور پانی اور ہوا اور سورج اور حرارت و برودت سب کا خالق ایک ہی خدا ہو۔ اور یہ انتظام صرف اسی صورت میں لاکھوں کروڑوں برس تک پیہم ایک باقاعدگی سے چل سکتا ہے جب کہ وہی ازلی وابدی خدا اس کو جاری رکھے۔ اور اس انتظام کو قائم کرنے والا لازماً ایک حکیم و رحیم پروردگار ہی ہو سکتا ہے جس نے زمین میں انسان اور حیوانات اور نباتات کو جب پیدا کیا تو ٹھیک ٹھیک ان کی ضروریات کے مطابق پانی بھی بنایا اور پھر اس پانی کو باقاعدگی کے ساتھ روئے زمین پر پہنچانے اور پھیلانے کے لیے یہ حیرت انگیز انتظامات کیے۔ اب اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو یہ سب کچھ دیکھ کر بھی خدا کا انکار کرے، یا اس کے ساتھ کچھ دوسری ہستیوں کو بھی خدائی میں شریک ٹھیرائے۔

اللہ یعنی خدا سے پھرا ہوا آدمی، جس کی عقل پر غفلت یا تعصب کا پردہ ٹھا ہوا ہو، کسی چیز کو دیکھ کر بھی کوئی سبق نہیں لے سکتا۔ اس کی حیوانی آنکھیں یہ تو دیکھ لیں گی کہ ہوائیں چلیں، بادل آتے، کڑک چمک ہوئی، اور بارش ہو گئی۔ مگر اس کا انسانی دماغ کبھی یہ نہ سوچے گا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے، کون کر رہا ہے اور مجھ پر اس کے کیا حقوق ہیں۔

۲۲ وین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کی وضاحت سورہ زمر عاشرہ نمبر ۳ میں کی جا چکی ہے۔

۲۳ یعنی تمام موجودات سے اس کا مقام بدرجہا بلند ہے۔ کوئی ہستی بھی جو اس کائنات میں موجود ہے، خواہ وہ کوئی فرشتہ ہو یا نبی یا ولی، یا اور کوئی مخلوق، اس کا مقام دوسری مخلوقات کے مقابلے میں چاہے کتنا ہی ارفع و اشرف ہو، مگر اللہ تعالیٰ کے بلند ترین مقام سے اس کے قریب ہونے تک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کجا کہ خدائی صفات و اختیارات میں اس کے شریک ہونے کا گمان

حکم سے روح نازل کر دیتا ہے تاکہ وہ ملاقات کے دن سے خبردار کر دے۔ وہ دن جب کہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ اس روز پکار کر پوچھا جائے گا، آج بادشاہی کس کی ہے؟ سارا عالم پکار اٹھے گا، اللہ واحد تھاہار کی کیا جائے۔

۲۴ یعنی ساری کائنات کا بادشاہ و فرمانروا ہے۔ کائنات کے تخت سلطنت کا مالک ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد دوم - صفحات ۳۶-۲۶۲-۲۶۱ - جلد سوم، ص ۸۷)

۲۵ روح سے مراد وحی اور نبوت ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد دوم صفحات ۵۲۸-۶۳۹)۔ اور یہ ارشاد کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر پاتا ہے یہ روح نازل کرتا ہے، اس معنی میں ہے کہ اللہ کے فضل پر کسی کا اجارہ نہیں ہے۔ جس طرح کوئی شخص یہ اعتراف کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ فلاں شخص کو حسن کیوں دیا گیا اور فلاں شخص کو حافظہ یا ذہانت کی غیر معمولی قوت کیوں عطا کی گئی، اسی طرح کسی کو یہ اعتراف کرنے کا بھی حق نہیں ہے کہ منصب نبوت کے لیے فلاں شخص ہی کو کیوں چنا گیا اور جسے ہم چاہتے تھے اسے کیوں نہ نبی بنا یا گیا۔

۲۶ یعنی جس روز تمام انسان اور جن اور شیاطین بیک وقت اپنے رب کے سامنے جمع ہونگے اور ان کے اعمال کے سارے گواہ بھی حاضر ہوں گے۔

۲۷ یعنی دنیا میں تو بہت سے بر خود غلط لوگ اپنی بادشاہی و جباری کے ڈنکے پیٹتے رہے اور بہت سے احمق ان کی بادشاہیاں اور کبرائیاں مانتے رہے، اب بناؤ کہ بادشاہی فی الواقع کس کی ہے؟ اقتیارات کا اصل مالک کون ہے؟ اور حکم کس کا چلتا ہے؟ یہ ایسا مضمون ہے جسے اگر کوئی شخص گوش ہوش سے سنے تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا بادشاہ یا آمر مطلق بنا بیٹھا ہو، اس کا زہرہ آب ہو جائے اور ساری جباریت کی ہوا اس کے دماغ سے نکل جائے۔ اس موقع پر تاریخ کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ سامانی خاندان کا فرمانروا نصر بن احمد (۳۰۱-۳۳۱ھ) جب نیشاپور میں داخل ہوا تو اس نے ایک دربار منعقد کیا اور تخت پر بیٹھنے کے بعد فرمائش کی کہ کارروائی کا افتتاح

کہا جائے گا، آج ہر منفق کو اُس کماٹی کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کی تھی۔ آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ اور اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔ اُسے نبی، ڈرا اور ان لوگوں کو اُس دن سے جو قریب آگاہ تھے۔ جب کھینچے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ قرآن مجید کی تلاوت سے ہو۔ یہ سن کر ایک بزرگ آگے بڑھے اور انہوں نے یہی رکوع تلاوت کیا جس وقت وہ اس آیت پر پہنچے تو نضر بن عدسہ طاری ہو گئی۔ لڑنا ہوا تخت سے اترنا، تاج سر سے اتار کر سجدے میں گر گیا اور بولا اے رب، بادشاہی تیری ہی ہے نہ کہ میری۔

۲۸۹ یعنی کسی نوعیت کا ظلم بھی نہ ہوگا۔ واضح رہے کہ جہاں کے معاملہ میں ظلم کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اجر کا مستحق ہو اور وہ اس کو نہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ بٹنے اجر کا مستحق ہو اُس سے کم دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ منرا کا مستحق نہ ہو مگر اسے منرا دے ڈالی جائے۔ چوتھے یہ کہ جو منرا کا مستحق ہو اسے منرا نہ دی جائے۔ پانچویں یہ کہ جو کم منرا کا مستحق ہو اسے زیادہ منرا دے دی جائے۔ چھٹے یہ کہ مظلوم منرا دیکھتا رہ جائے اور ظالم اس کی آنکھوں کے سامنے صاف بری ہو کر نکل جائے۔ ساتویں یہ کہ ایک کے گناہ میں دوسرا پکڑ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا نشانہ یہ ہے کہ ان تمام نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کا ظلم بھی اس کی عدالت میں نہ ہونے پائے گا۔

۲۹۰ مطلب یہ ہے کہ اللہ کو حساب لینے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ وہ جس طرح کائنات کی ہر مخلوق کو بیک وقت رزق دے رہا ہے اور کسی کی رزق رسانی کے انتظام میں اُس کو ایسی مشغولیت نہیں ہوتی کہ دوسروں کو رزق دینے کی اسے فرصت نہ ملے، وہ جس طرح کائنات کی ہر چیز کو بیک وقت دیکھ رہا ہے، ساری آوازوں کو بیک وقت سن رہا ہے، تمام چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملات کی بیک وقت تدبیر کر رہا ہے، اور کوئی چیز اس کی توجہ کو اس طرح جذب نہیں کرتی کہ اُسی وقت وہ دوسری چیزوں کی طرف توجہ نہ کر سکے۔ اُسی طرح وہ ہر ہر فرد کا بیک وقت محاسبہ بھی کر لے گا اور ایک مقدمے کی سماعت کرنے میں اُسے ایسی مشغولیت لاحق نہ ہوگی کہ اُسی وقت دوسرے بے شمار مقدمات کی سماعت نہ کر سکے۔ پھر اس کی عدالت میں اس بنا پر بھی کوئی تاخیر

پیسے کھڑے ہونگے۔ ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔
اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ رات تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا
رکھے ہیں۔ اور اللہ ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلہ کرے گا۔ رہے وہ جن کو (یہ مشرکین) اللہ کو
چھوڑ کر پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔ بلاشبہ اللہ ہی سب کچھ

نہ ہوگی کہ واقعات مقدمہ کی تحقیق اور اس کے لیے شہادتیں فراہم ہونے میں وہاں کوئی مشکل پیش آئے۔
حاکم عدالت براہ راست خود تمام حقائق سے واقف ہوگا۔ ہر فریق مقدمہ اس کے سامنے بالکل
بے نقاب ہوگا۔ اور واقعات کی کھلی کھلی ناقابل انکار شہادتیں چھوٹی سے چھوٹی جزئی تفصیلات
تک کے ساتھ بلاتا خیر پیش ہو جائیں گی۔ اس لیے ہر مقدمے کا فیصلہ جھٹ پٹ ہو جائے گا۔

۳۲ قرآن مجید میں لوگوں کو بار بار یہ احساس دلایا گیا ہے کہ قیامت ان سے کچھ دور نہیں ہے بلکہ
قریب ہی لگی کھڑی ہے اور ہر لمحہ آسکتی ہے۔ کہیں فرمایا اِنِّیْ اَهِمُّ اللّٰهِ فَلَآ تَسْتَعْجِلُوْهُ (النحل: ۱)۔ کہیں
اِرْتَادَہُمْ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمْ وَہُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مَّعْرُضُوْنَ (الانبیاء: ۱)۔ کہیں متنبیہ کیا گیا۔
اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَاَنْشَقَّ الْقَمَرُ (القمر: ۱)۔ کہیں فرمایا گیا اِذِ قَتَّ الْاَزِقَّةُ لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ کَاشِفَةٌ (النجم: ۵۷)۔ ان ساری باتوں سے مقصود لوگوں کو متنبیہ کرنا ہے کہ قیامت کو دور کی
چیز سمجھ کر بے خوف نہ رہیں اور سنبھلنا ہے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سنبھل جائیں۔

۳۳ اصل میں لفظ جمیم استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد کسی شخص کا ایسا دوست ہے جو اس کو
پٹتے دیکھ کر جوش میں آئے اور اسے بچانے کے لیے دوڑے۔

۳۴ یہ بات برسبیل تنزیل، کفار کے عقیدہ شفاعت کی تردید کرتے ہوئے فرمائی گئی ہے۔ حقیقت
میں تو وہاں ظالموں کا کوئی شفیع سرے سے ہوگا ہی نہیں، کیونکہ شفاعت کی اہلیت اگر مل بھی سکتی ہے
تو اللہ کے نیک بندوں کو مل سکتی ہے، اور اللہ کے نیک بندے کبھی کافروں اور مشرکوں اور فساق
فجار کے دوست نہیں ہو سکتے کہ وہ انہیں بچانے کے لیے سفارش کا خیال بھی کریں۔ لیکن چونکہ کفار و
مشرکین اور گمراہ لوگوں کا بالعموم یہ عقیدہ رہا ہے، اور آج بھی ہے، کہ ہم جن بزرگوں کے دامن گرفتہ ہیں

سننے اور دیکھنے والا ہے ع

کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ طاقت ور تھے اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین میں چھوڑ گئے ہیں۔ مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور اُن کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس اُن کے رسول بتیات لے کر آتے اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا، یقیناً وہ بڑی قوت والا اور مزادینے میں بہت سخت ہے۔

ہم نے موسیٰ کو فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف اپنی نشانیوں اور نمایاں

وہ کبھی ہمیں دوزخ میں نہ جانے دیں گے بلکہ اڑ کر کھڑے ہو جائیں گے اور غیباً کبھی چھوڑیں گے، اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں ایسا شفیع کوئی بھی نہ ہوگا جس کی بات مانی جائے اور جس کی سفارش اللہ کو لازماً قبول ہی کرنی پڑے۔

یعنی تمہارے معبودوں کی طرح وہ کوئی اندھا بہرا خدا نہیں ہے جسے کچھ پتہ نہ ہو کہ جس آدمی کے معاملے کا وہ فیصلہ کر رہا ہے اس کے کیا کرتوت تھے۔

بتیات سے مراد تین چیزیں ہیں۔ ایک ایسی نمایاں علامات اور نشانیاں جو ان کے مامور من اللہ ہونے پر شاہد تھیں۔ دوسرے ایسی روشن دلیلیں جو ان کی پیش کردہ تعلیم کے حق ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔ تیسرے زندگی کے مسائل و معاملات کے متعلق ایسی واضح ہدایات جنہیں دیکھ کر ہر معقول آدمی یہ جان سکتا تھا کہ ایسی پاکیزہ تعلیم کوئی جھوٹا خود غرض آدمی نہیں دے سکتا۔

حضرت موسیٰ کے قصے کی دوسری تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو جلد اول، صفحات ۵ تا

۷۹-۲۲۵-۴۵۹۔ جلد دوم ۶۳ تا ۸۸۔ ۳۰۱ تا ۳۱۰۔ ۳۳۰-۳۶۵-۳۶۶-۳۷۰-۳۸۲-۳۸۳

۴۱ تا ۴۴-۴۶ تا ۴۹-۴۱-۴۲-۸۵-۸۸ تا ۱۲۱-۲۴۹-۲۸۰-۲۸۰ تا

سندِ ماموریت کے ساتھ بھیجا، مگر انہوں نے کہا "ساحر ہے، کذاب ہے" پھر جیت بھاری

۴۹۸-۵۵۷ تا ۵۶۰-۶۱۰-۶۱۳ تا ۶۳۹-جلد چہارم، سورۃ احزاب، آیت ۶۹-الصافات
آیات ۱۱۴ تا ۱۲۲-

۳۶۔ ہامان کے متعلق مخالفین کے اعتراضات کا جواب اس سے پہلے سورۃ قصص کے حاشی
میں دیا جا چکا ہے (جلد سوم، صفحہ ۶۱۵)

۳۷۔ یعنی ایسی صریح علامات کے ساتھ جن سے یہ امر مشتبه نہیں رہ جاتا تھا کہ وہ اللہ کی طرف سے
بھیجے گئے ہیں اور ان کی پشت پر اللہ رب الغلین کی طاقت ہے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کے قصے
کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان پر ایک فائرنگاہ ڈالنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کونسی
علامات تھیں جن کو یہاں ان کے مامورین اللہ ہونے کی کھلی سند قرار دیا جا رہا ہے۔ اول تو یہی ایک
عجیب بات تھی کہ جو شخص چند سال پہلے فرعون کی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر کے ملک سے فرار ہو گیا
تھا اور جس کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے وہ اچانک ایک لاشیٰ یے ہوتے سیدھا فرعون کے بھرے
دربار میں درانہ چلا آتا ہے اور دھڑتے کے ساتھ بادشاہ اور اس کے اعیانِ سلطنت کو مخاطب کر کے
دعوت دیتا ہے کہ وہ اسے اللہ رب الغلین کا نائندہ تسلیم کر کے اس کی ہدایات پر عمل کریں، اور
کسی کو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ حالانکہ حضرت موسیٰ جس قوم سے تعلق رکھتے تھے وہ
اس بڑی طرح غلامی کے جوئے تلے پس رہی تھی کہ اگر الزام قتل کی بنا پر ان کو فوراً گرفتار کر لیا جاتا
تو اس بات کا کوئی اندیشہ نہ تھا کہ ان کی قوم بغاوت تو درکنار، احتجاج ہی کے لیے زبان کھول سکے گی۔
اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عصا اور یدِ بیضاء کے معجزے دیکھنے سے بھی پہلے فرعون اور
اس کے اہلِ دربار محض حضرت موسیٰ کی آمد ہی سے مرعوب ہو چکے تھے اور پہلی نظر ہی میں انہیں
محسوس ہو گیا تھا کہ یہ شخص کسی اور ہی طاقت کے بل بوتے پر آیا ہے پھر جو عظیم الشان معجزے پے درپے
ان کے ہاتھ سے صادر ہوئے ان میں سے ہر ایک یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ یہ جادو کا نہیں
خدائی طاقت ہی کا کرشمہ ہے۔ آخر کس جادو کے زور سے ایک لاشیٰ فی الواقع اثر و طابن سکتی ہے؟

طرف سے حق ان کے سامنے آئے آیا تو انہوں نے کہا "جو لوگ ایمان لاکر اس کے ساتھ شامل ہوتے ہیں ان سب کے لڑکوں کو قتل کرو اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دو" مگر کافروں کی چال اکارت ہی گئی۔

یا ایک پورے ملک میں فحط پڑ سکتا ہے؛ یا لاکھوں مربع میل کے علاقے میں ایک نوٹس پر طرح طرح کے طوفان آسکتے ہیں اور ایک نوٹس پر وہ ختم ہو سکتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق فرعون اور اس کی سلطنت کے تمام ذمہ دار لوگ، زبان سے چاہے انکار کرتے رہے ہوں مگر دل ان کے پوری طرح جان چکے تھے کہ حضرت موسیٰ فی الواقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوتے ہیں۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم ص ۶۵ تا ۶۸۔ جلد سوم، ص ۱۰۰ تا ۱۰۸۔ ۴۸۶ تا ۴۹۲ - ۵۶۰)

۳۸ یعنی جب پے درپے معجزات اور نشانیاں دکھا کر حضرت موسیٰ نے یہ بات ان پر پوری طرح ثابت کر دی کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں اور مضبوط دلائل سے اپنا برسرِ حق ہونا پوری طرح واضح کر دیا۔

۳۹ سورہ اعراف، آیت ۱۲۷ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا تھا کہ آخر موسیٰ کو یہ کھلی چھٹی کب تک دی جائے گی، اور اس نے کہا تھا کہ میں عنقریب بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دینے کا حکم دینے والا ہوں (تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۷۱-۷۲)۔ اب یہ آیت بتاتی ہے کہ فرعون کے ہاں سے آخر کار یہ حکم جاری کر دیا گیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ حضرت موسیٰ کے حامیوں اور پیروں کو اتنا خوف زدہ کر دیا جائے کہ وہ ڈر کے مارے ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔

۴۰ دوسرا مطلب اس فقرے کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کافروں کی جو چال بھی تھی، گراہی اور ظلم و جور اور مخالفت حق ہی کی راہ میں تھی، یعنی حق واضح ہو جانے اور دلوں میں قائل ہو جانے کے باوجود وہ اپنی ضد میں بڑھتے ہی چلے گئے اور صداقت کو نچا دکھانے کے لیے انہوں نے کوئی ذلیل سے

ایک روز فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا "چھوڑو مجھے، میں اس موسیٰ کو قتل کیے
ذیل تدبیر اختیار کرنے میں بھی باک نہ کیا۔

لکھ یہاں سے جس واقعہ کا بیان شروع ہو رہا ہے وہ تاریخ بنی اسرائیل کا ایک نہایت اہم
واقعہ ہے جسے خود بنی اسرائیل بالکل فراموش کر گئے ہیں۔ بائبل اور تلمود، دونوں اس کے ذکر سے
خالی ہیں، اور دوسری اسرائیلی روایات میں بھی اس کا کوئی نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ صرف قرآن مجید
ہی کے ذریعہ سے دنیا کو یہ معلوم ہوا ہے کہ فرعون اور حضرت موسیٰ کی کشمکش کے دور میں ایک وقت
یہ واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ اس قصے کو جو شخص بھی پڑھے گا، بشرطیکہ وہ اسلام اور قرآن کے خلاف
تعصب میں اندھانہ ہو چکا ہو، وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے گا کہ دعوت حق کے نقطہ نظر سے
یہ قصہ بہت بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے، اور جاتے خود یہ بات بعید از عقل و قیاس بھی نہیں ہے
کہ حضرت موسیٰ کی شخصیت، ان کی تبلیغ، اور ان کے ہاتھوں ظہور پذیر ہونے والے حیرت انگیز
معجزات سے متاثر ہو کر خود فرعون کے اعیان سلطنت میں سے کوئی شخص دل ہی دل میں ایمان
لے آیا ہو اور فرعون کو ان کے قتل پر آمادہ دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا ہو۔ لیکن مغربی مستشرقین علم و
تحقیق کے لمبے چوڑے دعوؤں کے باوجود، تعصب میں اندھے ہو کر جس طرح قرآن کی روشن
صدائتوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انسائیکلو
پیڈیا آف اسلام میں مضمون "موسیٰ" کا صنف اس قصے کے متعلق لکھتا ہے:

"قرآن کی یہ کہانی کہ فرعون کے دربار میں ایک مومن موسیٰ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے

پوری طرح واضح نہیں ہے (سورہ ۴۰ - آیت ۲۸)۔ کیا ہمیں اس کا تقابل اس قصے سے

کرنا چاہیے جو ہگاد میں بیان ہوا ہے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ تھرونے فرعون کے

دربار میں عفو سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا؟

گویا ان مدعیان تحقیق کے ہاں یہ بات تڑپے شدہ ہے کہ قرآن کی ہر بات میں ضرور کٹرے ہی ڈالنے

ہیں۔ اب اگر اس کے کسی بیان پر حروف زنی کی کوئی بنیاد نہیں ملتی تو کم از کم یہی شوشہ چھوڑ دیا جائے کہ یہ

دیتا ہوں، اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالے گا، یا ملک میں فساد برپا کرے گا۔

قصہ پوری طرح واضح نہیں ہے، اور چلتے چلتے یہ شک بھی پڑھنے والوں کے دل میں ڈال دیا جائے کہ ہٹکاؤا میں تیغ و کا جو قصہ حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے کا بیان ہوا ہے وہ کہیں سے محمد مصلیٰ اللہ علیہ وسلم، نے سن لیا ہوگا، اور اسے لاکر یہاں اس شکل میں بیان کر دیا ہوگا یہ ہے "علمی تحقیق" کا وہ انداز جو ان لوگوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں اختیار کر رکھا ہے۔ لہذا اس فقرے میں فرعون نے تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ گویا کچھ لوگوں نے اسے روک رکھا ہے جن کی وجہ سے وہ حضرت موسیٰ کو قتل نہیں کر رہا ہے، ورنہ اگر وہ مانع نہ ہوتے تو وہ کبھی کا انہیں ہلاک کر چکا ہوتا۔ حالانکہ دراصل باہر کی کوئی طاقت اسے روکنے والی نہ تھی، اس کے اپنے دل کا خوف ہی اس کو اللہ کے رسول پر ہاتھ ڈالنے سے روکے ہوئے تھا۔

لہذا یعنی، مجھے اس سے انقلاب کا خطرہ ہے، اور اگر یہ انقلاب برپا نہ بھی کر سکے تو کم از کم یہ خطرہ تو ہے ہی کہ اس کی کارروائیوں سے ملک میں فساد رونما ہوگا، لہذا بغیر اس کے کہ یہ کوئی مستند منرائے موت مجرم کرے، محض تحفظ امن عام (MAINTENANCE OF PUBLIC ORDER) کی خاطر اسے قتل کر دینا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ اس شخص کی ذات سے فی الواقع امن عام کو خطرہ ہے یا نہیں، تو اس کے لیے صرف ہنرمیٹی کا اطمینان کافی ہے۔ سرکار عالی اگر مطمئن ہیں کہ یہ خطرناک آدمی ہے تو مان لیا جانا چاہیے کہ واقعی خطرناک اور گردن زدنی ہے۔

اس مقام پر دین بدل ڈالنے، کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے جس کے اندیشے سے فرعون حضرت موسیٰ کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ یہاں دین سے مراد نظام حکومت ہے اور فرعون کے قول کا مطلب یہ ہے کہ انی اخافت ان یغیر سلطانکم (روح المعانی، ج ۲، ص ۵۶)۔ بالفاظ دیگر، فرعون اور اس کے خاندان کے اقتدارِ اعلیٰ کی بنیاد پر مذہب و سیاست اور تمدن و معیشت کا جو نظام مصر میں چل رہا تھا، وہ ملک کا دین تھا، اور فرعون کو حضرت موسیٰ کی دعوت سے اسی دین کے بدل جانے کا

موسیٰ نے کہا: میں نے تو ہر اُس متکبر کے مقابلے میں جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے۔

اس موقع پر آل فرعون میں سے ایک مومن شخص، جو اپنا ایمان چھپاتے ہوئے تھا،

خطرہ تھا۔ لیکن ہر زمانے کے مکار حکمرانوں کی طرح اُس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے اپنے ہاتھ سے اقتدار نکل جائے گا خوف ہے اس لیے میں موسیٰ کو قتل کرنا چاہتا ہوں، بلکہ صورتِ معاملہ کو اُس نے اس طرح پیش کیا کہ لوگو! خطرہ مجھے نہیں، تمہیں لاحق ہے، کیونکہ موسیٰ کی تحریک اگر کامیاب ہو گئی تو تمہارا دین بدل جائے گا مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ میں تو تمہاری فکر میں گھلا جا رہا ہوں کہ میرے سایہٴ اقتدار سے محفوظ ہو کر تمہارا کیا بنے گا۔ لہذا جس ظالم کے ہاتھوں یہ سایہ تمہارے سر سے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے اسے قتل کر دینا چاہیے کیونکہ وہ ملک اور قوم کا دشمن ہے۔

۴۴ یہاں دو برابر کے احتمال ہیں، جن میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینے کے لیے کوئی قرینہ

موجود نہیں ہے۔ ایک احتمال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اُس وقت دربار میں خود موجود ہوں، اور فرعون نے ان کی موجودگی میں انہیں قتل کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہو، اور حضرت نے اُس کو اور اُس کے درباریوں کو خطاب کر کے اُسی وقت بر ملا یہ جواب دے دیا ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں فرعون نے اپنی حکومت کے ذمہ دار لوگوں کی کسی مجلس میں یہ خیال ظاہر کیا ہو، اور اس گفتگو کی اطلاع آنجناب کو اہل ایمان میں سے کچھ لوگوں نے پہنچائی ہو، اور اسے سن کر آپ نے اپنے پیروؤں کی مجلس میں یہ بات ارشاد فرمائی ہو۔ ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، حضرت موسیٰ کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون کی دھمکی اُن کے دل میں ذرہ برابر بھی خوف کی کوئی کیفیت پیدا نہ کر سکی اور انہوں نے اللہ کے بھروسے پر اس کی دھمکی اسی کے منہ پر مار دی۔ اس واقعہ کو جس موقع پر قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے، اس سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی یہی جواب اُن سب ظالموں کو ہے جو یوم الحساب سے بے خوف ہو کر آپ کو قتل کر دینے کی سازشیں کر رہے ہیں۔

بول اٹھا: کیا تم ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟ حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بیانات لے آیا۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پٹ پڑے گا۔ لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ نم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آجائیں گے۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو۔ اے میری قوم کے لوگو، ان تمہیں بادشاہان

۵۷ یعنی اس نے ایسی کھلی کھلی نشانیاں تمہیں دکھادی ہیں جن سے یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہو چکی ہے کہ وہ تمہارے رب کا بھیجا ہوا رسول ہے۔ مومن آل فرعون کا اشارہ ان نشانیوں کی طرف تھا جن کی تفصیلات اس سے پہلے گزر چکی ہیں تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۶۵-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵۔

۶۴۸ جلد سوم، ص ۱۰۰ تا ۱۰۷-۱۰۸ تا ۱۱۳-۱۱۴-۱۱۵

۵۷ یعنی اگر ایسی صریح نشانیاں کے باوجود تم اسے جھوٹا سمجھتے ہو تب بھی تمہارے لیے مناسب یہی ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، کیونکہ دوسرا احتمال، اور نہایت قوی احتمال یہ بھی ہے کہ وہ سچا ہو اور اس پر ہاتھ ڈال کر تم خدا کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ۔ اس لیے اگر تم اسے جھوٹا بھی سمجھتے ہو تو اس سے تعرض نہ کرو۔ وہ اللہ کا نام لے کر جھوٹ بول رہا ہو گا تو اللہ خود اس سے منٹ لے گا قریب قریب اسی طرح کی بات اس سے پہلے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی فرعون سے کہہ چکے تھے۔ **وَإِنَّ لَكُمْ لَعَنَةً مُنَوَّلِي** فَأَعْتَزِلُوهُمْ (الذخاں: ۲۱)۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

یہاں یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ مومن آل فرعون نے گفتگو کے آغاز میں کھل کر یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ پر ایمان لے آیا ہے، بلکہ ابتداء وہ اسی طرح کلام کرتا رہا کہ وہ بھی فرعون ہی کے گروہ کا ایک آدمی ہے اور محض اپنی قوم کی بھلائی کے لیے بات کر رہا ہے۔ مگر جب فرعون اور اس کے درباری کسی طرح راہ راست پر آنے نظر نہ آئے تو آخر میں اس نے اپنے ایمان کا راز فاش کر دیا، جیسا کہ پانچویں رکوع میں اس کی تقریب سے ظاہر ہوتا ہے۔

۵۷ اس فقرے کے دو مطلب ممکن ہیں، اور غالباً مومن آل فرعون نے قصداً یہ دو معنی بات کی ہے

حاصل ہے اور زمین میں تم غالب ہو، لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آگیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا؟

فرعون نے کہا "میں تو تم لوگوں کو وہی راستے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے۔ اور میں اسی راستے کی طرف تمہاری رہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے۔"

کہی تھی کہ ابھی وہ کھل کر اپنے خیالات ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ ایک ہی شخص کی ذات میں راست روی عبیسی خوبی اور کذب و اقترا جیسی بدی جمع نہیں ہو سکتیں۔ تم علانیہ دیکھ رہے ہو کہ موسیٰ ایک نہایت پاکیزہ سیرت اور کمال درجہ کا بلند کردار رکھنے والا انسان ہے۔ اب آخر یہ بات تمہارے دماغ میں کیسے ساتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اتنا بڑا جھوٹا ہو کہ اللہ کا نام لے کر نبوت کا بے بنیاد دعویٰ کر بیٹھے، اور دوسری طرف اللہ سے اتنے اعلیٰ درجے کے اخلاق عطا فرمائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ اگر حد سے تجاوز کر کے موسیٰ علیہ السلام کی جان لینے کے درپے ہو گے اور ان پر جھوٹے الزامات عائد کر کے اپنے ناپاک منصوبے عمل میں لاؤ گے تو یاد رکھو کہ اللہ تمہیں ہرگز کامیابی کا راستہ نہ دکھائے گا۔

۲۸؎ یعنی کیوں اللہ کی دی ہوئی اس نعمتِ غلبہ و اقتدار کی ناشکری کر کے اس کے غضب کو

اپنے اپنے پر دعوت دیتے ہو؟

۲۹؎ فرعون کے اس جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ یہ راز نہیں پاسکتا تھا کہ اس کے

دربار کا یہ امیر دل میں مومن ہو چکا ہے۔ اسی لیے اس نے اس شخص کی بات پر کسی ناراضی کا اظہار تو نہیں کیا، البتہ یہ واضح کر دیا کہ اس کے خیالات سننے کے بعد بھی وہ اپنی راستے بدلنے کے لیے تیار نہیں ہے۔